ازدواجی جائیداد کا شرعی وقانونی جائزہ

مولانا ڈاکٹر اسد اللہ شیر

اسلام آباد

❶ ۔مقدمہ

ازدواجی جائیداد (Matrimonial Property) کا مسئلہ عصر حاضر کے اہم قانونی اور سماجی مباحث میں سے ایک ہے۔ کچھ عرصے سے یہ سوال زیر غور ہے کہ ازدواجی زندگی کے دوران حاصل ہونے والی جائیداد کی ملکیت کا تعین کس بنیاد پر کیا جائے؟ آیا محض نکاح کے تعلق اور ازدواجی زندگی میں بیوی کی گھریلو خدمات، بچوں کی تربیت اور شوہر کے ساتھ تعاون کی بنا پر اسے اس جائیداد میں شریک قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا ملکیت کے ثبوت کے لیے شریعت اسلامیہ کسی مستقل شرعی سبب کی متقاضی ہے؟ یہی وہ بنیادی سوال ہے جس نے کچھ اہم شرعی اور قانونی سوالات کو جنم دیا ہے۔

پاکستان میں یہ مسئلہ اس وقت زیادہ نمایاں ہوا جب مارچ 2026ء میں اسلام آباد ہائی کورٹ کے فاضل جج جناب محسن اختر کیانی صاحب نے ایک مقدمے (عمارہ وقاص بنام محمد وقاص رشید) میں اس موضوع کو زیر بحث لاتے ہوئے حکومت کو اس بابت قانون سازی کی سفارش کی۔ انہوں نے فیصلے میں قرار دیا کہ شادی کے بعد شوہر کی کمائی میں صرف شوہر کی محنت کا عمل دخل نہیں ہوتا، بلکہ خاتون خانہ نے گھر کے معاملات سنبھال کر اس جائیداد کو پروان چڑھانے میں غیر مادی حصہ ڈالا ہوتا ہے، اس لیے یہ ناانصافی ہے کہ جدائی کے بعد اس جائیداد پر صرف شوہر قابض ہو جائے اور بیوی کو اس میں حصہ نہ دیا جائے۔ اس ضمن میں انہوں نے کچھ عمومی اسلامی اصول و مقاصد کی جانب بھی اشارہ کیا، اور بہت سے اسلامی ممالک کے قوانین کا حوالہ دے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نوعیت کا قانون بادی النظر میں اسلامی احکام کے ساتھ متصادم نہیں۔

اس فیصلے کے بعد علمی حلقوں میں اس بارے میں گفتگو کا آغاز ہوا اور تین مختلف آراء سامنے آئیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ اس طرح کی قانون سازی وقت کی اہم ضرورت ہے، جس سے ہمارے معاشرے میں خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے ناروا سلوک کا سدباب ہو سکے گا اور خواتین کو ان کی

قربانی کا کچھ صلہ مل جائے گا۔

دوسری رائے کے حاملین کا خیال ہے کہ شریعت میں ازدواجی جائیداد میں حصہ داری کا کوئی تصور نہیں، تاہم انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ عورت کی محنت کا صلہ اگرچہ ازدواجی جائیداد کی شکل میں نہ ہو، مگر اس کے لیے کوئی اور طریق کار ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے قرآن مجید کی ان آیات کا سہارا لیا جن میں مطلقہ عورت کو متعہ یا متاع (مالی عطیہ جو شوہر طلاق دینے کے بعد مطلقہ عورت کو حسن سلوک اور دلجوئی کے طور پر دیتا ہے) دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان آیات میں متاع کی کوئی مقدار متعین نہیں کی گئی، بلکہ معروف طریقے سے متاع دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ متاع کے وجوب کی صورتوں اور اس کی مقدار میں فقہائے کرام کا اختلاف رہا ہے، تاہم اہل علم کی اس جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس کی تعیین کا اختیار قاضی کو دیا جائے، تاکہ وہ شوہر کی جائیداد، اس کی تشکیل میں بیوی کی غیر مادی محنت، اور بیوی کی موجودہ مالی حالت جیسے عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک معتد بہ حصہ شوہر کی جائیداد میں سے بیوی کے لیے بطور متاع مقرر کر دے، اور یہ حصہ مہر کے علاوہ ہوگا۔ اس طرح ان کے بقول طے شدہ اسلامی اصولوں سے انحراف بھی لازم نہیں آئے گا اور طلاق کے بعد عورتوں کی مشکلات کا مداوا بھی ہو سکے گا۔

تیسری رائے کے حاملین کا موقف یہ ہے کہ یہ صورتحال کوئی نئی نہیں، دور رسالت اور فقہائے کرام کے ادوار میں بھی ایسی صورتحال موجود رہی ہے، مگر اس سے نمٹنے کے لیے اسلامی اصول سے انحراف و اضافے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس موقف کے مطابق شوہر کے انتقال کی صورت میں بیوی کو جائیداد میں جو حصہ ملتا ہے، وہی اس کا جائز حق ہے، اور قبل از موت جدائی کی صورت میں مہر اور نفقہ سے اضافی کوئی چیز مقرر کرنے کا قانون اسلامی شریعت کے لیے اجنبی ہے، جس کی بنیاد مغربی افکار و تصورات پر قائم ہے۔

دوسرا موقف چونکہ متاع کے تفصیلی احکام پر مستقل بحث کا متقاضی ہے، اس لیے زیر نظر مقالے میں اس سے تفصیلی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس مقالے میں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ازدواجی جائیداد میں بیوی کو حصہ دار بنانا شرعی اصولوں سے میل نہیں کھاتا اور اس سے کئی اصولوں سے انحراف لازم آئے گا جس سے نکاح جیسا مقدس رشتہ مادی خودغرضیوں کی بھینٹ چڑھ جائے گا اور معاشرتی، اخلاقی اور شرعی پیچیدگیاں جنم لیں گی۔ چنانچہ اس مقالے کا مقصد خالص فقہی جزئیات کی تفصیل میں جانا نہیں، بلکہ صرف یہ واضح کرنا ہے کہ شوہر کی جائیداد میں بیوی کو محض ازدواجی تعلق کی بنیاد پر شریک قرار دینا شریعت اسلامیہ کے عمومی اصولوں، فقہی قواعد اور اسلامی نظام ملکیت سے کس حد تک ہم آہنگ ہے، اور اگر اس تصور کو قانونی شکل دی جائے تو اس کے کیا فقہی، قانونی، معاشرتی اور عملی نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔

❷ ۔اصولی مباحث

ازدواجی جائیداد کے مسئلے پر کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے چند بنیادی اور اصولی نکات کو واضح کرنا ضروری ہے، جو اس پوری بحث کی صحیح تفہیم کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے بعد ازدواجی جائیداد کے تصور کے فقہی وقانونی نتائج واثرات پر گفتگو ہوگی:

1۔کسی قانون کے اسلامی ہونے کا اصل معیار

پہلی بنیادی بات یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کسی قانون کے اسلامی ہونے کے لیے صرف یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ کسی مسلم ملک میں نافذ العمل ہے۔ یہ استدلال کہ چونکہ فلاں مسلم ریاست ۔مثلاً تیونس، الجزائر یا مراکش وغیرہ۔ میں کوئی قانون رائج ہے، لہٰذا وہ لازماً اسلامی بھی ہوگا، ایک کمزور طرز استدلال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ متعدد مسلم ممالک طویل عرصے تک مختلف استعماری طاقتوں کے زیر اثر رہے، جس کے نتیجے میں ان کے قانونی نظام بڑی حد تک مغربی قوانین سے متاثر ہوئے۔ انہی اثرات کے نتیجے میں ایسے کئی ممالک ۔خصوصاً وہ جو فرانسیسی استعمار کے زیر اثر رہے۔ میں ازدواجی جائیداد کے ایسے قوانین متعارف کرائے گئے جن کے تحت میاں بیوی کو نکاح کے وقت یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کو انفرادی ملکیت (Separate Ownership) یا مشترکہ ملکیت (Joint Ownership) کے اصول پر قائم رکھنا چاہتے ہیں، اور بعد ازاں یہی معاہدہ قانونی طور پر لازم قرار پاتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی قانون کے شرعی جائزے کا اصل معیار یہ نہیں ہے کہ وہ کسی مسلم ریاست میں نافذ ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ آیا وہ قرآن کریم، سنت نبوی ﷺ، اجماع اور فقہی اصول کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا نہیں؟ اگر کوئی قانون ان بنیادی مصادر سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو محض اس کا کسی مسلم ملک میں رائج ہونا اس کے اسلامی ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

2۔شریعت کے قوانین عمومی اصول پر مبنی ہوتے ہیں

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کے احکام عمومی حالات، غالب معاشرتی اصولوں اور اجتماعی مصالح کو سامنے رکھ کر وضع کیے گئے ہیں جنہیں ''Presumptions'' کہا جا سکتا ہے۔ محض چند استثنائی یا جذباتی واقعات کی بنیاد پر عمومی قوانین تبدیل نہیں کیے جاتے۔ اس اصول کو سمجھنے کے لیے دیت کی مثال کو مدنظر رکھا جا سکتا ہے۔ شریعت میں دیت کو اس مالی نقصان کا معاوضہ سمجھا جاتا ہے جو کسی فرد کے قتل کی صورت میں اس کے خاندان کو پہنچتا ہے۔ چونکہ عمومی معاشرتی نظام میں مرد خاندان کی کفالت کا بنیادی ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے اس کے فقدان سے مالی نقصان نسبتاً زیادہ تصور کیا گیا ہے اور اسی بنیاد پر مرد کی دیت خاتون کی دیت سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ اب اگر کوئی استثنائی صورت ایسی ہو کہ پورا خاندان ایک عورت کی

آمدنی پر منحصر ہو، تو یہ واقعہ اپنی جگہ اہم ہونے کے باوجود عمومی قانون کو تبدیل نہیں کرتا۔ استثنائی حالات کے لیے الگ انتظامات ممکن ہیں، مگر وہ مستقل اصول نہیں بن جاتے۔

اسی طرح وراثت کے مسائل میں بھی بعض اوقات جذباتی انداز میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے انتقال کے بعد اس کے یتیم پوتے کی کفالت کا کیا انتظام ہوگا؟ اور اس کا سہارا کون بنے گا؟ یقیناً یہ ایک اہم مسئلہ ہے، لیکن شریعت نے وراثت کا نظام محض انسانی جذبات پر نہیں، بلکہ عمومی اصول پر قائم کیا ہے۔ عمومی اصول یہ ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا دادا کی میراث میں وارث نہیں بنتا، تاہم اگر دادا اپنے یتیم پوتے کو کچھ دینا چاہے تو وہ اپنی زندگی میں اسے ہبہ کر سکتا ہے، یا ایک تہائی مال تک وصیت کر سکتا ہے۔ یہ مفروضہ بھی درست نہیں کہ یتیم پوتا لازماً غریب، محتاج اور بے سہارا ہی ہوگا، ممکن ہے کہ اسے اپنے مرحوم والد کی طرف سے جو جائیداد ملی ہو، اس کی وجہ سے وہ اپنے چچا سے بھی زیادہ مالی طور پر مستحکم ہو، لہٰذا محض یتیمی یا مالی کمزوری کو میراث کے حق کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا، میراث کا اصول ہے کہ قریبی وارث کے ہوتے ہوئے دور کے وارث کو حصہ نہیں ملتا، خواہ قریبی رشتہ دار مالدار اور دور کا رشتہ دار غریب ہو، اس لیے کہ میراث کی بنیاد رشتے کی نوعیت پر ہے، نہ کہ دیگر عوامل پر۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا'' (النساء:11)

ترجمہ: ''تمہیں اس بات کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں ہے کہ تمہارے باپ بیٹوں میں سے کون فائدہ پہنچانے کے لحاظ سے تم سے زیادہ قریب ہے۔''

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ وراثت کا نظام انسانی اندازوں اور وقتی جذبات کے بجائے اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ اسی طرح گواہی کے باب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

''اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا'' (النساء:135)

ترجمہ: ''وہ شخص (جس کے خلاف گواہی دینے کا حکم دیا جا رہا ہے) چاہے امیر ہو یا غریب، اللہ دونوں قسم کے لوگوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے، لہٰذا ایسی نفسانی خواہش کے پیچھے نہ چلنا جو تمہیں انصاف کرنے سے روکتی ہو، اور اگر تم توڑ مروڑ کرو گے (یعنی غلط گواہی دو گے) یا (سچی گواہی دینے سے) پہلو بچاؤ گے تو (یاد رکھنا کہ) اللہ تمہارے کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔''

اس آیت سے بھی یہی اصول سامنے آتا ہے کہ شریعت کے احکام ذاتی ترجیحات یا جذبات کے بجائے عدل اور الٰہی حکمت کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ازدواجی جائیداد کے مسئلے میں بھی اگر بعض انفرادی واقعات میں کسی عورت کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہو تو اس بنیاد پر ملکیت کے عمومی شرعی اصولوں میں تبدیلی کا مطالبہ کرنا درست نہیں۔

3۔ ہر معاشرتی مسئلے کا ذمہ دار شریعت کو قرار دینا درست نہیں

معاصر مباحث میں ایک اہم مغالطہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ بہت سے ایسے مسائل جن کی اصل وجہ معاشرتی ظلم، جاہلانہ رسم ورواج اور سماجی ناانصافیاں ہوتی ہیں، ان کا ذمہ دار شریعت کو ٹھہرا دیا جاتا ہے، اور انہیں حل کرنے کے بجائے شریعت سے ہی ان مسائل کا حل طلب کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواتین کو درپیش بہت سے مسائل اسلامی تعلیمات کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان سے انحراف کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں، جبری شادیاں شریعت کی نہیں، بلکہ معاشرتی جبر کی پیداوار ہیں؛ خواتین کو وراثت سے محروم کرنا اسلامی حکم نہیں بلکہ صریح ظلم ہے؛ اور مہر ادا نہ کرنا دینی تعلیمات کا تقاضا نہیں بلکہ ان سے انحراف ہے۔

چنانچہ ہمارے معاشرے میں مہر کا معاملہ محض رسمی حیثیت اختیار کر چکا ہے، بظاہر تو بھاری مقدار میں سونا یا جائیداد کو مہر میں لکھ دیا جاتا ہے، لیکن عملی طور پر عورت کو اس کا حق ادا نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح میراث کے معاملے میں بعض لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر بیوی کو وراثت مل بھی جائے تو وہ آخرکار اس کے بچوں ہی کو منتقل ہوگی، اس لیے عورت کو حصہ دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے مواقع پر مختلف حیلوں بہانوں سے خواتین کی حق تلفی کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس لیے خواتین کے حقوق کے حوالے سے سب سے پہلے ان حقوق کے نفاذ کی ضرورت ہے جو شریعت پہلے ہی واضح طور پر عطا کر چکی ہے، مگر معاشرہ عملاً انہیں ادا نہیں کرتا۔ بدقسمتی سے اکثر اوقات گفتگو ان حقیقی مسائل کے بجائے اس بحث کی طرف منتقل ہو جاتی ہے کہ عورت کی دیت مختلف کیوں ہے؟ یا بعض صورتوں میں وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ کیوں ہے؟ یا عورت کی گواہی مرد کے برابر کیوں نہیں، حالانکہ اگر خواتین کو ان کے اصل شرعی حقوق ہی پوری طرح دے دیے جائیں تو معاشرے کے بہت سے مسائل خود بخود کم یا ختم ہو سکتے ہیں، لہٰذا کسی شرعی حکم میں تبدیلی کا مطالبہ کرنے کے بجائے ضروری ہے کہ معاشرتی خرابیوں اور ان کے حقیقی اسباب کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے۔

4۔ ملکیت کے ثبوت کے لیے شرعی بنیاد ضروری ہے

ازدواجی جائیداد کے مسئلے میں سب سے بنیادی فقہی سوال یہ ہے کہ آیا محض ازدواجی تعلق کسی شخص کو دوسرے کی ملکیت میں شریک قرار دینے کے لیے کافی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اسلامی قانون ملکیت کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں تلاش کرنا ضروری ہے۔

شریعت کی رو سے کسی بھی شخص کی ملکیت اس وقت تک ثابت نہیں ہوتی، جب تک اس کے لیے کوئی معتبر شرعی سبب موجود نہ ہو۔ فقہ اسلامی میں ملکیت کے اسباب متعین ہیں، مثلاً خرید وفروخت، ہبہ، وراثت، وصیت، شرکت یا کوئی اور ایسا سبب جسے شریعت نے ملکیت کا ذریعہ تسلیم کیا ہو۔ اس کے برعکس محض

کسی شخص سے تعلق، قرابت یا جذباتی وابستگی ملکیت کے ثبوت کے لیے کافی نہیں۔ اسی بنا پر محض نکاح کے رشتے کی بنیاد پر بیوی کو شوہر کی ملکیت میں شریک قرار دینا، یا شوہر کو بیوی کی ملکیت میں شریک سمجھنا، اس وقت تک شرعاً درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے کوئی مستقل شرعی یا قانونی سبب موجود نہ ہو۔

یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ عورت گھر سنبھالتی ہے، بچوں کی تربیت کرتی ہے، شوہر کے ساتھ زندگی کے نشیب و فراز میں شریک رہتی ہے، اور خاندانی نظام کے استحکام میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے، اور ان خدمات کی قدردانی ضروری بھی ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کیا صرف انہی قربانیوں کی بنیاد پر ملکیت کا حق خود بخود ثابت ہو جاتا ہے؟ فقہی نقطۂ نظر سے اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ ملکیت کا ثبوت جذبات یا خدمات کے بجائے شرعی اسباب پر موقوف ہے۔

یہاں یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا اس نوعیت کی صورتحال صرف موجودہ زمانے میں پیش آئی یا دور رسالت میں بھی موجود تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے جذباتی دلائل صرف عصر حاضر کی پیداوار نہیں، بلکہ دور رسالت میں بھی موجود تھے، لیکن اس کے باوجود فیصلہ عمومی اصول کی بنیاد پر ہی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حضانت کے معاملہ میں حاضر ہونے والی عورت کا واقعہ مذکور ہے:

''إن ابني هذا كان بطني له وعاء، وثديي له سقاء، وحجري له حواء، وإن أباه طلقني، وأراد أن ينتزعهٗ مني.''

ترجمہ: ''یہ میرا بیٹا ہے، میرا پیٹ اس کا گھر رہا، میری چھاتی اس کے پینے کا برتن (پلنے کا ذریعہ) رہی، میری گود اس کا ٹھکانہ رہی، اب اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے، اور اسے مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔''

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''أنت أحق به ما لم تنكحي.''

ترجمہ: ''جب تک کسی اور سے تم نکاح نہ کرو، تم اس بچے کی زیادہ حق دار ہو۔''

یہ واقعہ اس بات کی مثال ہے کہ عہد نبوی میں بھی جذباتی اور معاشرتی پہلو پیش کیے جاتے تھے، مگر فیصلے اصولوں کی بنیاد پر ہی کیے جاتے تھے، اور موجودہ مقدمے میں چونکہ عورت حق پر تھی، اس لیے اسی کے حق میں فیصلہ دیا گیا۔ اسی نوعیت کی ایک اور مثال حضرت خولہ بنت ثعلبہؓ کا مشہور واقعہ بھی ہے۔ سنن ابن ماجہ کی روایت ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ظہار کے مسئلے میں نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئیں اور نہایت دردمندی سے شوہر کی شکایت کرتے ہوئے عرض کیا:

''أكل شبابي، ونثرت له بطني، حتى إذا كبرت سني وانقطع ولدي ظاهر مني.''

ترجمہ: ''میرا شوہر میری جوانی کھا گیا، میں اس کی اولاد جنتی رہی، جب میں بوڑھی ہو گئی اور

ولادت کا سلسلہ منقطع ہو گیا، تو اس نے مجھ سے ظہار کر لیا۔''

روایات میں آتا ہے کہ وہ انتہائی تنگ حالی میں تھیں، حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جانے کے لیے کپڑے بھی کسی سے عاریتاً لیے تھے۔ انہوں نے یہ بھی عرض کیا:

''إن لي صبيةً صغارًا إن ضممتهم إليه ضاعوا وإن ضممتهم إليّ جاعوا.''

ترجمہ: ''میرے چھوٹے بچے ہیں، اگر میں ان کو ان کے باپ کے حوالے کروں تو وہ ضائع ہو جائیں گے، اور اگر اپنے پاس رکھوں تو بھوک کا شکار ہوں گے۔''

قرآن مجید نے اسی واقعے کے بارے میں فرمایا:

''قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ'' (المجادلۃ:1)

ترجمہ: ''بیشک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کرتی جاتی ہے۔''

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور رسالت میں بھی معاشرتی اور جذباتی پہلو پیش کیے جاتے تھے، مگر اس کے باوجود مسئلے کا حل اصولی بنیادوں اور شریعت کے احکام ہی کے مطابق بیان کیا جاتا تھا۔ اس دور میں بھی طلاقیں واقع ہوئیں، ازدواجی تعلقات ختم ہوئے، مگر کوئی ایک واقعہ ایسا نہیں ملتا کہ بیوی کو شوہر کی جائیداد میں حصہ دار بنایا گیا ہو۔ اسی طرح احادیث میں نیک عورت کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ وہ شوہر کی عدم موجودگی میں اس کے مال اور عزت کی حفاظت کرتی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی اس بارے میں منقول ہے:

''وإن غاب عنها نصحته في نفسها وماله.''

ترجمہ: ''اور اگر اس کا شوہر غائب ہو تو وہ اپنے آپ کی اور اس کے مال کی حفاظت کرتی ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ'' (النساء:34)

ترجمہ: ''چنانچہ نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں، مرد کی غیر موجودگی میں اللہ کی دی ہوئی حفاظت سے (اس کے حقوق کی) حفاظت کرتی ہیں۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام ازدواجی زندگی میں عورت کے کردار اور تعاون کو بھرپور طور پر تسلیم کرتا ہے، مگر اس کے باوجود ملکیت کے احکام اصولی بنیادوں ہی پر قائم رکھتا ہے۔

فقہ اسلامی میں طلاق الفار کی مثال بھی اس باب میں اہم ہے۔ اگر کوئی شخص مرض موت میں اپنی بیوی کو طلاق بائن دے، تو حضور اکرم ﷺ نے اس صورت میں عورت کو وراثت کا حق دیا ہے، حالانکہ اصولی طور پر طلاق بائن کے بعد عورت وارث نہیں رہتی، لیکن چونکہ یہاں شوہر کی نیت بادی النظر میں بیوی کو

میراث سے محروم کرنا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اس کے لیے عمومی قواعد سے ہٹ کر ایک استثنائی اصول متعارف کرایا۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت جہاں ظلم اور حیلہ کا اندیشہ دیکھتی ہے، وہاں استثنائی احکام بھی خود مقرر کرتی ہے، لیکن جہاں ایسا کوئی استثنائی حکم موجود نہ ہو وہاں عمومی قواعد ہی نافذ رہتے ہیں۔ اس لیے ازدواجی جائیداد کے مسئلے کا فیصلہ بھی انہی عمومی اصولوں کی روشنی میں ہونا چاہیے، نہ کہ صرف جذباتی یا معاشرتی ہمدردیوں کی بنیاد پر۔

5۔ فقہ اسلامی میں مشترکہ جائیداد کا تصور

ازدواجی جائیداد کے مسئلے میں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ کیا فقہ اسلامی میں ایسی کوئی مثال موجود ہے، جس کی بنیاد پر محض باہمی تعلق یا طویل عرصے کی مشترکہ زندگی کو ملکیت میں شرکت کا سبب قرار دیا جا سکے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے فقہاء کی ان مباحث کا جائزہ لینا ضروری ہے جن میں مشترکہ محنت، مشترکہ سرمایہ یا مشترکہ تصرف کی بنیاد پر ملکیت کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

فقہی ذخیرے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء نے مشترکہ جائیداد کے مسئلے پر متعدد زاویوں سے گفتگو کی ہے، خصوصاً والد اور بیٹوں یا بھائیوں کی مشترکہ محنت کے حوالے سے۔ احناف کے متأخرین میں علامہ ابن عابدینؒ نے ''تنقيح الفتاوى الحامدية'' میں اس موضوع پر نسبتاً مفصل بحث کی ہے، جس سے اس باب کے عمومی اصول واضح ہوتے ہیں۔ اسی طرح علامہ ابن عابدینؒ نے ہی ''رد المحتار'' میں ''فصل في الشركة الفاسدة'' کے تحت ان میں سے اکثر صورتیں، خاص طور پر میاں بیوی کی جائیداد کی مختلف صورتیں ذکر کی ہیں۔

فقہاء کی تصریحات کے مطابق اگر والد تجارت یا کوئی اور کاروبار کرتا رہا ہو اور اس کے بیٹے برسوں تک اس کے ساتھ کام کرتے رہے ہوں، تو محض اس مشترکہ محنت کی بنا پر جائیداد خود بخود تمام افراد کی مشترکہ ملکیت قرار نہیں پاتی، اصول یہی ہے کہ جائیداد والد کی ملکیت شمار ہوگی جس نے کاروبار کا آغاز کیا تھا، الا یہ کہ باقاعدہ شرکت، سرمایہ کاری یا کسی دوسرے شرعی سبب کا ثبوت موجود ہو۔

اسی طرح اگر دو بھائیوں میں سے ایک بھائی محنت مزدوری کرتا رہے اور دوسرا گھر، زمین یا کاروبار کی نگرانی کرتا رہے، تو صرف اس خدمت کی بنیاد پر دونوں برابر کے مالک قرار نہیں دیے جائیں گے۔ ملکیت اسی شخص کی ہوگی جس نے شرعی طور پر اسے حاصل کیا ہو، جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ دونوں کے درمیان شرکت کا باقاعدہ معاہدہ موجود تھا یا دونوں نے مشترکہ سرمایہ کاری کی تھی۔

یہاں ایک اور بنیادی فرق بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، یعنی شرکت ملک اور شرکت عقد کا فرق۔ شرکت ملک اس وقت وجود میں آتی ہے جب متعدد افراد کسی شرعی سبب، مثلاً وراثت یا مشترکہ خریداری کے ذریعے مال کے مالک بن جائیں، ایسی صورت میں ہر شریک کی ملکیت اس کے متعین حصے کے مطابق ثابت

ہوتی ہے۔ اس کے برعکس شرکت عقد ایک اختیاری معاہدہ ہے، جس میں دو یا زیادہ افراد باہمی رضامندی سے سرمایہ، محنت یا دونوں کو یکجا کر کے کاروبار کرتے ہیں اور نفع ونقصان کی تقسیم پہلے سے طے شدہ اصولوں کے مطابق ہوتی ہے۔ اس فرق کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ محض ایک ہی گھر میں رہنا، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا یا طویل عرصہ مشترکہ زندگی گزارنا، فقہی اصطلاح میں شرکت کے قیام کے لیے کافی نہیں، جب تک اس کے لیے کوئی مستقل شرعی سبب موجود نہ ہو۔

فقہاء نے میاں بیوی کے درمیان مشترکہ ملکیت کی صورتوں پر بھی گفتگو کی ہے۔ اگر شادی کے بعد کوئی جائیداد دونوں نے اپنے مشترکہ سرمائے سے خریدی ہو، یا عورت نے اپنے ذاتی مال سے اس میں حقیقی مالی شراکت کی ہو، تو اس حد تک وہ جائیداد دونوں کی مشترکہ ملکیت شمار ہوگی، کیونکہ یہاں ملکیت کی بنیاد نکاح نہیں، بلکہ مالی شرکت ہے۔ اس کے برعکس اگر عورت نے محض گھریلو ذمہ داریاں ادا کی ہوں، شوہر کے کاروبار میں غیر رسمی معاونت کی ہو یا خاندانی نظام کو مستحکم رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا ہو، تو ان خدمات کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی قدر ومنزلت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن صرف انہی خدمات کی بنیاد پر مساوی یا مستقل ملکیت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ فقہ اسلامی میں ملکیت کے احکام' خدمات اور اخلاقی فضائل سے نہیں، بلکہ متعین شرعی اسباب سے وابستہ ہیں۔

6۔ نفقہ، مہر اور شرعی متوازن حل

ازدواجی جائیداد کے حق میں سب سے زیادہ پیش کیا جانے والا استدلال یہ ہے کہ بیوی نے برسوں گھر سنبھالا، بچوں کی تربیت کی، شوہر کو معاشی ذمہ داریوں کے لیے یکسو رکھا اور اس کی مالی ترقی میں بالواسطہ کردار ادا کیا، اس لیے طلاق یا علیحدگی کی صورت میں اسے شوہر کی جائیداد میں سے ایک متعین حصہ ملنا چاہیے۔ یہ استدلال بظاہر نہایت مؤثر ہے، لیکن اس کا شرعی تجزیہ کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا شریعت نے ان خدمات کے بدلے میں عورت کے لیے پہلے سے کوئی مالی حقوق مقرر کیے ہیں یا نہیں؟ اگر شریعت نے پہلے ہی ان خدمات کے عوض بعض حقوق کو واجب قرار دیا ہے تو پھر انہی خدمات کی بنیاد پر ایک نئے مالی حق کا اضافہ کرنا اصولی طور پر محل نظر ہوگا۔

فقہ اسلامی کے مطابق نکاح محض ایک سماجی تعلق نہیں، بلکہ ایک ایسا شرعی معاہدہ ہے جس کے نتیجے میں دونوں فریقوں پر باہمی حقوق وفرائض عائد ہوتے ہیں۔ انہی حقوق میں مہر بھی شامل ہے، جسے شریعت نے عورت کی تکریم اور اس کے مالی حق کے طور پر شوہر پر واجب قرار دیا ہے، مہر شرعاً محض ایک رسمی رقم نہیں بلکہ عورت کے احترام، نکاح کے عزم اور شوہر کی ذمہ داری کا اظہار ہے، مہر عورت کی ذاتی ملکیت اور اس کا مالی حق ہوتا ہے، اسے اس پر مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے، اور اگر شوہر مہر کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرے تو عورت اپنے اس حق کے حصول کے لیے قانونی چارہ جوئی بھی کر سکتی ہے۔

شوہر پر بیوی کے نفقہ کی ذمہ داری بھی ہے۔ فقہاء نے نفقہ کو جزاء الاحتباس قرار دیا ہے، یعنی نکاح کے بعد بیوی اپنے آپ کو ازدواجی زندگی کے لیے مخصوص کرتی ہے، اس کے نتیجے میں شوہر پر اس کی رہائش، خوراک، لباس اور دیگر ضروری اخراجات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، بلکہ شریعت نے بیوی کے نفقہ کو دیگر تمام اقارب کے نفقہ سے زیادہ مؤکد بنایا ہے، مثلاً والد پر اپنی نابالغ اولاد کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب اولاد خود صاحب مال نہ ہوں۔ اسی طرح بھائی بہن جیسے دیگر رشتہ داروں کا نفقہ بعض مخصوص حالات میں تب ہی واجب ہوتا ہے جب ان کے پاس اپنا کوئی مال نہ ہو اور وہ مسلمان ہوں۔ جبکہ بیوی کے حق میں یہ دونوں شرائط لاگو نہیں ہوتیں، اگر بیوی خود مالدار ہو تب بھی اس کا نفقہ شوہر کے ذمے ہی واجب ہے اور اس پر اپنا مال خرچ کرنا واجب نہیں، اسی طرح اگر بیوی اہل کتاب (یہودیہ یا نصرانیہ) ہو تب بھی اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا۔ یہ خصوصیات واضح کرتی ہیں کہ شریعت نے بیوی کے مالی تحفظ کے لیے پہلے ہی غیر معمولی اہتمام کیا ہے۔

بلکہ اس حق کو مزید مضبوط بنانے کے لیے میاں بیوی پہلے سے کسی مالی مقدار پر از خود بھی متفق ہو سکتے ہیں، اور نزاع کی صورت میں قاضی بھی کوئی مقدار متعین کر سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے قانونی ذرائع سے حاصل کیا جا سکتا ہے، اور اگر حاصل نہ ہو تو ان مہینوں کا خرچہ شوہر کے ذمے قرض بن جاتا ہے۔

اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ مہر کی بروقت ادائیگی، نفقہ کے حق کا مؤثر نفاذ اور وراثت میں خواتین کو ان کا مکمل حصہ دلانے کا پورا بندوبست کیا جائے اور عدالتی نظام کے ذریعے ان حقوق کی تنفیذ کی یقین دہانی کرائی جائے، اور نئے قانونی تصورات اختیار کرنے کے بجائے۔ جن سے ملکیت کے مسلمہ فقہی اصول متاثر ہوتے ہوں۔ ان حقوق کو عملی طور پر نافذ کیا جائے، جنہیں شریعت نے صراحت کے ساتھ مقرر کیا ہے۔

7۔ بیوی کو مہر کے طور پر شوہر کی جائیداد میں شریک کرنا

بعض اہل علم نے ازدواجی جائیداد کے مسئلے کا ایک متبادل حل یہ تجویز کیا ہے کہ نکاح کے وقت یہ شرط عائد کر دی جائے کہ اگر مستقبل میں میاں بیوی کے درمیان علیحدگی ہو تو شوہر اپنی جائیداد کا ایک متعین حصہ، مثلاً نصف، بیوی کو بطور مہر ادا کرے گا۔ بظاہر یہ تجویز عورت کے مالی تحفظ کا ایک آسان ذریعہ معلوم ہوتی ہے، لیکن فقہ اسلامی کے اصول کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے سے متعدد بنیادی اشکالات سامنے آتے ہیں۔

اس تجویز کا صحیح تجزیہ کرنے کے لیے پہلے یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ شرعی اعتبار سے اس شرط کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا اسے ہبہ قرار دیا جائے گا؟ مہر سمجھا جائے گا یا کسی مستقل مالی التزام کی حیثیت دی جائے گی؟ ان میں سے ہر احتمال کے جدا جدا فقہی احکام ہیں۔

اگر اس شرط کو ہبہ تصور کیا جائے تو یہ مشکل پیدا ہوتی ہے کہ فقہ اسلامی میں ہبہ کا تعلق ایسے مال سے ہوتا ہے جو عقد کے وقت موجود اور قابل ملکیت ہو۔ معدوم یا مستقبل میں حاصل ہونے والی جائیداد کا ہبہ اصولاً صحیح نہیں، کیونکہ معدوم چیز ہبہ کا محل نہیں بن سکتی۔ اگر اس شرط کو مہر قرار دیا جائے تو معاملہ مزید باریک

فقہی بحث کا متقاضی ہو جاتا ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق جن عقود میں دونوں طرف مالی عوض ہوتا ہے، جیسے بیع وغیرہ، ان میں معمولی جہالت بھی فساد عقد کا سبب بنتی ہے جس سے نزاع پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اس کے برعکس نکاح ان عقود میں سے ہے جن میں مالی عوض صرف ایک جانب ہوتا ہے، اس لیے اس میں معمولی درجے کی جہالت (جہالت یسیرہ) کو برداشت کیا جاتا ہے، لیکن جہالت فاحشہ قابل قبول نہیں ہوتی۔

اس کی مثال یوں سمجھی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ: ''میں نے تمہیں ایک جانور بیچ دیا''، تو یہ جہالت فاحشہ ہے، اور یہ کہنا کہ ''میں نے تمہیں ایک گھوڑا بیچ دیا'' جہالت یسیرہ ہے۔ دونوں صورتوں میں جہالت کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی، جبکہ نکاح کی صورت میں اگر کوئی جانور بغیر نام لیے بطور مہر مقرر کیا جائے تو یہ تقرر درست نہیں، لیکن اگر گھوڑا بطور مہر مقرر کیا جائے تو یہ تقرر درست ہے اور اوسط درجے کا گھوڑا بیوی کو بطور مہر دیا جائے گا۔

اس اصول کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اگر ہم موجودہ صورت پر غور کریں تو شوہر کا یہ کہنا کہ ''آئندہ زندگی میں جو بھی جائیداد ہوگی، اس کا آدھا حصہ بیوی کا ہوگا'' شرعی لحاظ سے مہر قرار دیا جانا درست نہیں، اس لیے کہ یہ جہالت فاحشہ ہے۔ البتہ اگر اس طرح کے افہام وتفہیم کے بعد یا اس کے بغیر شوہر طلاق کے وقت برضا ورغبت خویش بیوی کو جائیداد میں سے کچھ حصہ دے دے، تو اسے ابتدائی عطیہ اور ہبہ شمار کیا جائے گا، چونکہ اس وقت مال موجود، متعین اور قابل ملکیت ہوگا، اس لیے ایسی صورت اصولی طور پر درست ہوگی۔

اسی طرح اسے ایک مستقل مالی التزام بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ کسی بھی مالی التزام کے لیے شرعی بنیاد کا ہونا ضروری ہے، بصورت دیگر وہ مالی جرمانے کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جو شرعاً درست نہیں، مثلاً نکاح کے وقت یہ شرط عائد کی جائے کہ اگر شوہر بیوی کو طلاق دے گا یا دوسرا نکاح کرے گا تو اسے بیوی کو ایک متعین رقم ادا کرنا ہوگی، اس نوعیت کی شرط، فاسد شرط ہے، جسے محض مالی التزام قرار دے کر نکاح میں شامل کرنا درست نہیں۔

8۔ عقد نکاح کی شرعی نوعیت

اس بحث کے تسلسل میں ایک اور بنیادی اصول کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ شریعت میں ہر عقد کی ایک مخصوص قانونی اور شرعی نوعیت ہوتی ہے۔ ہر عقد کے احکام، آثار اور مقاصد اسی نوعیت کی بنیاد پر متعین کیے جاتے ہیں۔ اگر کسی عقد کو اس کی حقیقی نوعیت سے ہٹا کر کسی دوسرے عقد کے اصولوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے متعدد فقہی اور عملی اشکالات جنم لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیع ایک عقد معاوضہ ہے، جس کی بنیاد مالی تبادلے پر قائم ہے۔ اس میں ہر فریق اپنے مالی مفاد کے حصول کا حق رکھتا ہے، تاہم شریعت نے اس مفاد کو عدل، دیانت اور باہمی رضامندی کے اصولوں کا پابند بنایا ہے۔ اسی لیے بیع میں ایسا فائدہ ناجائز قرار دیا گیا ہے جس کے مقابلے میں کوئی مشروع عوض موجود نہ ہو، یا جس کے نتیجے میں

دوسرے فریق پر ظلم ہو، اسی طرح ایسی شرط بھی معتبر نہیں ہوتی جو عقد بیع کے مقتضا کے خلاف ہو اور اس میں کسی ایک فریق کا فائدہ ہو۔

اس کے برعکس ہبہ احسان اور تبرع کا عقد ہے، اس لیے اس کے احکام بیع سے مختلف ہیں۔ اسی طرح قرض بھی ارفاق اور تعاون کا عقد ہے، لہٰذا قرض دینے والے کو صرف اس بنیاد پر کوئی اضافی مالی منفعت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ اس نے اپنی رقم کچھ عرصے کے لیے دوسرے کے استعمال میں دے دی تھی یا اس عرصے میں اس کی رقم کی مالیت کم ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت ہر عقد کے مقاصد اور اس کی بنیادی نوعیت کو ملحوظ رکھ کر اس کے احکام مرتب کرتی ہے۔

اسی اصول کی روشنی میں عقد نکاح کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ نکاح کی نوعیت ایک مالی معاہدہ کی نہیں، بلکہ یہ ایک معاشرتی اور شرعی معاہدہ ہے۔ اس کا مقصد صرف زوجین کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین کرنا نہیں، بلکہ سکون، مودت، رحمت، عفت، نسل کی حفاظت اور خاندان کی تشکیل جیسے عظیم مقاصد کا حصول بھی ہے، اسی لیے قرآن کریم نے نکاح کو مضبوط عہد قرار دیا ہے، جو اس کی غیر معمولی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔

اگر نکاح کو اس تصور کے ساتھ جوڑ دیا جائے کہ ازدواجی زندگی کے اختتام پر ہر فریق دوسرے کی آئندہ حاصل ہونے والی جائیداد کا متعین حصہ حاصل کرے گا، تو رفتہ رفتہ نکاح کا مزاج ایک خالص معاشرتی اور اخلاقی معاہدے سے تبدیل ہو کر مالی مفادات کے گرد گھومنے لگے گا۔ اس صورت میں نکاح کا اصل مقصد پس منظر میں چلا جائے گا اور اس کے ساتھ وابستہ مالی نتائج فریقین کے طرز عمل پر اثر انداز ہونے لگیں گے۔

تجارتی معاملات میں ہر فریق اپنی مالی منفعت کے تحفظ کو ملحوظ رکھتا ہے اور کبھی کبھار اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو نقصان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا، اسی لیے حدیث قدسی کے مطابق جب تک ایک شریک دوسرے کے ساتھ خیانت نہیں کرتا، ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد ہوتی ہے، اور جب خیانت شروع ہو جاتی ہے تو یہ مدد اٹھ جاتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عموماً کاروبار میں کچھ عرصہ بعد اختلافات کی فضا بن جاتی ہے اور بہترین طریقے سے چلنے والا کاروبار بھی بالآخر ٹھپ ہو جاتا ہے۔

اگر یہی ذہنیت نکاح جیسے مقدس رشتے میں منتقل ہو جائے تو اس کے خاندانی اور معاشرتی اثرات نہایت گہرے ہوں گے۔ میاں بیوی کا تعلق ایثار، اعتماد اور باہمی تعاون کے بجائے مالی مفادات سے وابستہ ہونے لگے گا، اور نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کے فیصلے بھی بعض اوقات مالی مصلحتوں کے تابع ہو سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر کسی ملازم کی ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائرمنٹ ہو جائے اور اسے گریجویٹی یا پنشن کی مد میں خطیر رقم مل جائے جس کے خرچ ہو جانے کا اندیشہ ہو، تو بیوی اور اس کے خاندان والوں کی خواہش ہوگی کہ دونوں کے درمیان ابھی جدائی ہو جائے، تاکہ بیوی آدھی رقم کی مستحق بن سکے۔ یہی صورتحال بیوی کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر بھی پیش آسکتی ہے۔ مزید برآں، چونکہ عدالتی خلع کو پاکستانی عدالتی نظام میں

بیوی کا حق قرار دیا گیا ہے، ایسی صورت حال میں بیوی کی جانب سے نکاح ختم کرنے کے امکانات کسی خاص موقع پر بڑھنے کا قوی اندیشہ ہے، خصوصاً اگر مہر کی رقم معمولی ہو اور جائیداد سے ملنے والی رقم خطیر ہو، ایسی صورتحال میں نکاح بھی کاروبار کی طرح ایک خالص مادی معاہدہ بن جائے گا، جس کے مضر اثرات گھر، خاندان اور معاشرے پر یکساں مرتب ہوں گے۔

ایک اور پہلو یہ بھی سامنے آسکتا ہے کہ اگر شوہر کو یہ احساس ہو جائے کہ مستقبل قریب میں اسے کوئی بڑی آمدن، کاروباری نفع یا قیمتی جائیداد حاصل ہونے والی ہے، تو وہ اس کے حصول سے پہلے ہی بیوی کو طلاق دینے کی کوشش کرے گا، تاکہ بعد میں وہ اس دولت میں شریک نہ ہو سکے۔ اس طرح ایک ایسا قانون جو بظاہر تحفظ کے لیے بنایا جائے، بعض حالات میں ظلم، ناانصافی اور نکاح کے خاتمے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

❸ - ازدواجی جائیداد کے تصور سے پیدا ہونے والی عملی اور قانونی مشکلات

فقہی اصول کے علاوہ ازدواجی جائیداد کے تصور سے متعدد ایسے عملی، قانونی اور معاشرتی مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قانون سازی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی نئے قانونی تصور کو اختیار کرنے سے پہلے اس کے ممکنہ نتائج اور عملی پیچیدگیوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے۔ اس تناظر میں چند بنیادی مشکلات درج ذیل ہیں:

① - تعدد ازواج کی صورت میں تقسیم جائیداد

شریعت اسلامیہ نے بعض شرائط کے ساتھ ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دی ہے۔ ایسی صورت میں ازدواجی جائیداد کا تصور متعدد عملی سوالات کو جنم دیتا ہے، مثلاً اگر کسی کی چار بیویاں ہوں اور اس نے پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی بیوی کے ساتھ بالترتیب 10، 15، 20، 25 سال گزارے ہوں تو علیحدگی کی صورت میں جائیداد کی تقسیم کس بنیاد پر ہوگی؟ کیا تمام بیویوں کو برابر حصہ دیا جائے گا؟ یا ہر ایک کو ازدواجی زندگی کے دورانیے کے تناسب سے حق دیا جائے گا؟ یا پھر اس بات کا اندازہ لگایا جائے گا کہ جائیداد کی تشکیل میں کس بیوی کا کردار زیادہ تھا؟ ان میں سے ہر معیار متعدد عملی مشکلات کا باعث بنتا ہے۔

اگر محض نکاح کو مدنظر رکھا جائے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدھی جائیداد شوہر کی ہو اور آدھی جائیداد تمام بیویوں میں برابر تقسیم ہو۔ ایسی صورت میں جس بیوی نے شوہر کے ساتھ زیادہ عرصہ گزارا ہو، وہ ہرگز اس بات پر راضی نہ ہوگی کہ اسے بعد میں آنے والی بیویوں کے برابر حصہ دار بنایا جائے۔

اور اگر اس صورت حال میں یہ دیکھا جائے کہ جائیداد میں اضافے میں کس بیوی کا کتنا کردار رہا ہے؟ تو یہ ایک ایسا غیر یقینی پیمانہ ہے جس کے تعین میں بے شمار جھگڑے جنم لیں گے۔ نفع کے حصول کی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو بھی مشکلات پیدا ہوں گی، اس لیے کہ کاروبار میں عموماً ابتدا میں خاصی مشکلات پیش آتی

ہیں اور استحکام حاصل کرنے کے بعد ہی وہ نفع بخش بنتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر پہلی بیوی کے ساتھ ابتدائی پانچ سال گزرے ہوں اور کوئی جائیداد شادی کے چھٹے سال شوہر کی ملکیت میں آئی ہو، تو دوسری بیوی بھی اس میں برابر کی حصہ دار بننے کی دعویدار ہوگی، حالانکہ اس جائیداد کے پیچھے دوسری بیوی کی صرف ایک سال کی محنت، جبکہ پہلی بیوی کی چھ سال کی محنت شامل ہے۔

اور اگر ان تمام پہلوؤں سے قطع نظر صرف نکاح میں گزارے گئے عرصے کو مدنظر رکھتے ہوئے جائیداد کو اسی تناسب سے تقسیم کیا جائے، تو اس سے بھی عجیب نوعیت کے مسائل پیدا ہوں گے۔ اولاً: کچھ جائیداد ایک خاص وقت میں شوہر نے کمائی ہوتی ہے، اور اس وقت موجود بیویاں بعد میں آنے والی بیویوں کو حصہ دار قرار دینے پر راضی نہیں ہوں گی۔ ثانیاً: سب بیویوں کو ایک ساتھ طلاق نہیں دی جاتی؛ ایسی صورتحال میں اگر ایک یا دو بیویوں کو ابھی طلاق دے کر جائیداد میں سے حصہ دے کر رخصت کیا جائے، اور باقی بیویاں شوہر کے ساتھ بڑھاپے کا عرصہ گزار لیں جس میں باقی جائیداد خرچ ہو جائے، تو ایسی صورت میں باقی رہ جانے والی بیویوں کو کچھ نہیں مل سکے گا، حالانکہ انہوں نے شوہر کے ساتھ زیادہ قربانی کا عرصہ گزارا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف صورتوں میں متعدد پیچیدگیاں جنم لے سکتی ہیں۔

② - جائیداد کی تشکیل میں بالغ اولاد کا کردار

اسی تناظر میں ایک اور اہم نکتے کی طرف توجہ دینا بھی ضروری ہے کہ جائیداد اور مالی وسائل میں اضافہ ہمیشہ صرف میاں بیوی کی مشترکہ جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات بالغ اولاد بھی اس میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ عملاً بہت سے خاندانوں میں بیٹے اور بیٹیاں اپنی محنت، ملازمت، کاروبار اور بیرون ملک کمائی کے ذریعے خاندان کی مالی حیثیت کو مستحکم کرتے ہیں، بلکہ بعض صورتوں میں تو والدین کی جائیداد میں ہونے والا نمایاں اضافہ اولاد ہی کی قربانیوں اور تعاون کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں محض بیوی کو جائیداد میں مستقل حصہ دار قرار دینا درست نہیں۔

③ - قانون وراثت کے ساتھ ممکنہ تعارض

مزید برآں، اسلامی قانون وراثت کا عمومی مزاج بھی اس تصور سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ شریعت نے بہت سے مقامات پر مرد اور عورت کے حصص میں ایک متوازن تناسب قائم کیا ہے: عموماً بیٹی کو بیٹے کے مقابلے میں نصف حصہ، بہن کو بھائی کے مقابلے میں نصف حصہ، اور بیوی کو شوہر کے مقابلے میں نصف حصہ دیا جاتا ہے۔ اور یہ تفاوت بھی ذمہ داریوں میں تفاوت کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ نفقہ کی مد میں مرد پر زیادہ یا مکمل ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور خاتون پر ذمہ داری کم ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں بیوی کو آدھی جائیداد کا حصہ دار بنانا اس اصول سے بھی متصادم ہے۔

اسی طرح اگر ازدواجی جائیداد کے اصول کو بعد از مرگ بھی لاگو کیا جائے تو قرآن مجید کی نص کے مطابق شوہر کی موت کی صورت میں بیوہ کو چوتھائی یا آٹھواں حصہ بطور میراث دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اسے آدھی جائیداد میں حصہ دار ٹھہرانا دیگر ورثہ کی حق تلفی بھی ہے اور نص قرآنی کی مخالفت بھی۔ اسی طرح بیوی کے انتقال کی صورت میں شوہر کو آدھا یا چوتھائی حصہ بطور میراث ملتا ہے، اور اگر اسے مزید آدھی جائیداد بطور ازدواجی جائیداد بھی دی جائے تو بیوی کے دیگر ورثہ کے لیے یا تو کچھ نہیں بچے گا یا صرف ایک چوتھائی حصہ رہ جائے گا۔ اسی تعارض سے بچنے کے لیے کچھ ممالک میں موت کی صورت میں جدائی کو ازدواجی جائیداد کے قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اور صرف زندگی میں تفریق کی صورت میں بیوی کو جائیداد میں حصہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

اس آخری صورتحال سے بچنے کے لیے یہ علاج بھی بے جا ہے کہ بیوی کو تو شوہر کی جائیداد میں حصہ دیا جائے، مگر شوہر کو بیوی کی جائیداد میں حصہ نہ دیا جائے، اس لیے کہ جس طرح شوہر کی کمائی میں بیوی کی غیر مادی اور بالواسطہ محنت شامل ہوتی ہے، اسی طرح بیوی کی کمائی میں بھی شوہر کی محنت شامل ہوتی ہے۔

④۔ خلع کی صورت میں پیش آنے والے مسائل

ایک اور قابل غور مسئلہ خلع کا ہے۔ بعض اوقات شوہر ازدواجی تعلق برقرار رکھنا چاہتا ہے، جبکہ بیوی خلع کے ذریعے نکاح ختم کرنے پر بضد ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ کبھی عدالت میں خلع کا دعویٰ دائر کرتی ہے، جس میں اسے مہر سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ ایسی صورتحال میں جائیداد کا کیا حکم ہوگا؟ اگر جائیداد میں اسے حصہ دیا جائے تو یہ شوہر پر ظلم ہوگا کہ نکاح بھی ختم ہو گیا اور آدھی جائیداد سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ اور اگر بیوی کو ازخود نکاح ختم کر دینے کی وجہ سے جائیداد میں حصہ نہ دیا جائے تو اس صورت میں بھی بیوی کی بالواسطہ محنت کو نظر انداز کر دینا لازم آتا ہے۔ اسی الجھن سے نمٹنے کے لیے کچھ ممالک میں عورت کی جانب سے خلع کے دعوے کی صورت میں اسے ازدواجی جائیداد میں حصہ دار نہیں بنایا جاتا۔

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ نکاح میں شوہر کو پابند رکھنے کے لیے مہر کی ایک خطیر رقم مقرر کر دی جاتی ہے، یا کوئی زمین کا قطعہ وغیرہ مہر میں لکھ دیا جاتا ہے، اور اس کا مطالبہ فوراً نہیں کیا جاتا، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر شوہر کسی وقت طلاق دے تو اس سے یہ خطیر رقم وصول کی جا سکے۔ ایسی صورت میں اگر جدائی ہو جائے تو شوہر کو مہر کی خطیر رقم بھی دینی ہوگی اور اس کے علاوہ جائیداد میں سے بھی آدھا حصہ دینا ہوگا، جس سے شوہر پر دوہرا بوجھ پڑے گا۔

⑤۔ قرضوں اور مالی ذمہ داریوں سے متعلق پیچیدگیاں

ازدواجی جائیداد کے تصور سے قرضوں اور دیگر مالی ذمہ داریوں کے حوالے سے بھی متعدد نئے

قانونی اور عملی نزاعات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر ازدواجی تعلق کے خاتمے کے وقت شوہر مقروض ہو، تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوگا کہ جائیداد کی تقسیم سے قبل قرضہ منہا کیا جائے گا یا بعد میں؟ فطری طور پر شوہر کا موقف یہ ہوگا کہ پہلے تمام واجب الادا قرضوں کی ادائیگی کی جائے، اس کے بعد باقی ماندہ جائیداد میں کسی قسم کی تقسیم عمل میں آئے، جبکہ بیوی کا موقف یہ ہوگا کہ بعض قرضے ذاتی نوعیت کے تھے یا ایسی ضروریات کے لیے حاصل کیے گئے تھے جن کا ازدواجی زندگی یا مشترکہ خاندانی اخراجات سے کوئی تعلق نہیں تھا، لہٰذا انہیں ازدواجی جائیداد سے منہا نہ کیا جائے۔

اسی طرح اگر قرضہ جائیداد کی مالیت کے برابر یا اس سے زیادہ ہو تو ایک نیا سوال پیدا ہوگا کہ کیا بیوی بھی اس قرض کی ذمہ دار ہوگی؟ شوہر یہ استدلال کر سکتا ہے کہ چونکہ قرضہ مشترکہ خاندانی ضروریات یا کاروبار کے لیے حاصل کیا گیا تھا، اس لیے جس طرح بیوی جائیداد میں حصہ دار ہے، اسی طرح اسے قرض کی ذمہ داری میں بھی شریک ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس بیوی یہ موقف اختیار کرے گی کہ قرض لینے کا فیصلہ شوہر کا ذاتی فعل تھا، اس لیے اس کی ادائیگی کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوگی۔ اس نوعیت کے اختلافات عدالتی تنازعات میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

⑥۔ازدواجی جائیداد کے تعین کا عملی مسئلہ

ازدواجی جائیداد کے تصور میں ایک بنیادی عملی اشکال خود اس جائیداد کی تعیین بھی ہے۔ بظاہر یہ سوال آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن عملی صورتوں میں اس میں متعدد پیچیدگیاں ہیں، مثلاً اگر کسی شخص نے شادی سے دس سال قبل ایک کاروبار شروع کیا، ابتدائی دس برس مسلسل محنت کے باوجود اسے کوئی قابل ذکر نفع حاصل نہ ہوا، اور گیارہویں سال اس نے نکاح کیا، جس کے بعد کاروبار ترقی کرنے لگا اور نمایاں منافع حاصل ہونے لگا، تو ایسی صورت میں بیوی یہ دعویٰ کرے گی کہ اصل مالی ترقی اس کی ازدواجی زندگی کے دوران ہوئی، اس لیے وہ اس منافع میں شریک ہے۔ اس کے برعکس شوہر کا موقف یہ ہوگا کہ بعد میں حاصل ہونے والا منافع درحقیقت ان دس برسوں کی مسلسل محنت اور سرمایہ کاری کا نتیجہ ہے جو نکاح سے پہلے کی گئی تھی، لہٰذا اس منافع کو محض نکاح کے بعد حاصل ہونے کی بنیاد پر ازدواجی جائیداد قرار دینا درست نہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسری مثال یہ ہے کہ کوئی شخص نکاح کے بعد پچیس برس ملازمت کرتا رہے، لیکن ریٹائرمنٹ سے ایک سال قبل میاں بیوی کے درمیان علیحدگی ہو جائے، جبکہ ریٹائرمنٹ پر اسے گریجویٹی، پنشن یا دیگر مالی مراعات کی صورت میں خطیر رقم حاصل ہو۔ ایسی صورت میں شوہر یہ موقف اختیار کرے گا کہ چونکہ یہ رقم اس وقت وصول ہوئی جب نکاح ختم ہو چکا تھا، اس لیے بیوی اس میں شریک نہیں۔ دوسری طرف بیوی یہ استدلال کرے گی کہ یہ تمام مالی مراعات درحقیقت ان پچیس برسوں کی ملازمت کا ثمرہ ہیں، جن میں چوبیس برس دونوں ازدواجی رشتے میں منسلک رہے، لہٰذا اسے اس رقم میں حصہ ملنا چاہیے۔

ان دونوں مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ صرف یہ معیار اختیار کر لینا کہ جائیداد یا مالی منفعت کب حاصل ہوئی، مسئلے کا حل فراہم نہیں کرتا، کیونکہ بہت سی مالی کامیابیاں طویل المدت محنت، سابقہ سرمایہ کاری اور تدریجی ترقی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ایسے حالات میں یہ تعین کرنا کہ کس اثاثے یا مالی منفعت کا کتنا حصہ ازدواجی زندگی کا حاصل ہے، نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر اس نوعیت کے قانون کے نفاذ سے ایسے بے شمار مقدمات اور اختلافات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لیے کوئی واضح اور یکساں معیار متعین کرنا آسان نہیں۔

❹۔ازدواجی جائیداد کے تصور کے معاشرتی اور قانونی نتائج

فقہی اور قانونی مباحث کے بعد یہ سوال بھی نہایت اہم ہے کہ اگر ازدواجی جائیداد کے تصور کو قانونی صورت دے دی جائے تو اس کے معاشرتی، عدالتی اور دیگر قانونی نتائج کیا ہوں گے؟ کسی بھی قانون کا جائزہ صرف اس کے نظریاتی حسن کی بنیاد پر نہیں لیا جاتا، بلکہ اس کے عملی نتائج اور سماجی اثرات بھی قانون سازی کے عمل میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں بطور نمونہ چند نتائج کا ذکر کیا جاتا ہے:

1۔بے نامی جائیداد کے رجحان میں اضافہ

جب کسی قانونی نظام کے نتیجے میں کسی شخص کو اپنی ملکیت کے ایک بڑے حصے سے محروم ہونے کا اندیشہ ہو، تو عملی طور پر اس سے بچنے کے مختلف ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس تناظر میں یہ خدشہ موجود ہے کہ ازدواجی جائیداد سے متعلق قانون سازی بے نامی جائیدادوں اور مصنوعی مالی انتظامات کے رجحان میں اضافے کا سبب بن سکتی ہے۔ ممکن ہے بعض افراد اپنی جائیداد اپنے والدین، بہن بھائیوں، اولاد یا دیگر قابل اعتماد اشخاص کے نام منتقل کرنا شروع کر دیں، تاکہ بعد میں قانونی تقسیم سے بچ سکیں۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف عدالتی تنازعات بڑھیں گے، بلکہ ملکیت کے حقیقی تعین میں بھی دشواریاں پیدا ہوں گی۔

2۔نکاح سے گریز کے رجحان کا امکان

اس نوعیت کے قوانین کے نتیجے میں نکاح سے گریز اور بے نکاحی تعلقات کے رجحان میں اضافہ ہو سکتا ہے، چنانچہ آج کل بعض ممالک میں یہی صورتحال پیدا ہو چکی ہے کہ لوگ کئی دہائیوں تک زن و شوہر کی طرح اکٹھے رہتے ہیں مگر نکاح نہیں کرتے، کیونکہ وہ قانونی و مالی پیچیدگیوں اور جائیداد میں حصہ دینے سے بچنا چاہتے ہیں۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ہر معاشرے میں لازماً یہی صورت حال پیدا ہوگی، لیکن یہ ایک ایسا پہلو ضرور ہے جسے قانون سازی کے وقت پیش نظر رکھنا چاہیے، خصوصاً ایسے معاشروں میں جہاں خاندانی نظام پہلے ہی مختلف سماجی چیلنجز کا سامنا کر رہا ہو۔

3۔ پاکستان میں عائلی قانون سازی کا تجربہ

جن اہل علم کا یہ موقف ہے کہ متعۂ طلاق سے متعلق مناسب قانون سازی کے ذریعے اس مسئلے کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے، اس موقف کا فقہی جائزہ اس مقالے کا موضوع نہیں۔ تاہم اس موقع پر پاکستان میں عائلی قوانین سے متعلق قانون سازی کے تاریخی تجربے کی طرف مختصر اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مستقبل میں اس نوعیت کی کسی بھی قانون سازی کا جائزہ لیتے وقت ماضی کے تجربات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان کی قانون سازی کا تاریخی پس منظر اس بات پر شاہد ہے کہ جب بھی عائلی مسائل کے بارے میں حکومت نے قانون سازی کی ہے، وہ اکثر و بیشتر شریعت کے خلاف ہی ہوئی ہے۔ چنانچہ جب عائلی قوانین میں اصلاحات کے لیے کمیشن تشکیل دیا گیا تو اس میں اسلامی قانون کے ماہرین کو مناسب نمائندگی نہیں دی گئی، اور صرف ایک عالم دین کو کمیشن کا رکن بنایا گیا۔ کمیشن کی بیشتر سفارشات پر ان کا اختلافی نوٹ صدا بصحرا ہی ثابت ہوا، اور بالآخر انہی سفارشات کی بنیاد پر مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961ء وجود میں آیا، جس میں ایسی شقیں متعارف کرائی گئیں جو شریعت سے صریح متصادم تھیں۔ اس پر پورے ملک کی عوام اور دینی حلقوں کی جانب سے شدید تنقید کی گئی، مگر اس کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، بلکہ اس قانون کو اتنا تحفظ فراہم کیا گیا کہ گزشتہ صدی کی 80 اور 90 کی دہائی کی اسلامائزیشن کی لہر بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

بعد ازاں جب آئین کے تحت قوانین کو اسلامی احکام کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کے لیے وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی تو مسلم پرسنل لاء کو اس کے دائرۂ اختیار سے مستثنیٰ رکھا گیا، جس کے نتیجے میں یہ آئینی سوال پیدا ہوا کہ آیا نکاح و طلاق سے متعلق قوانین بھی مسلم پرسنل لاء میں شامل ہیں یا نہیں؟ اس مسئلے کے حتمی تعین میں ایک طویل عرصہ صرف ہوا، حتیٰ کہ بعد ازاں سپریم کورٹ نے پرسنل لاء کی ایسی تشریح اختیار کی جس کے نتیجے میں نکاح اور طلاق سے متعلق قوانین وفاقی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار میں آ گئے۔ اس کے بعد وفاقی شرعی عدالت نے مسلم فیملی لاز آرڈیننس کی بعض دفعات کے بارے میں فیصلے صادر کیے، تاہم ان فیصلوں کے خلاف دائر اپیلیں تا حال سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ میں زیر التوا ہیں، جس کے باعث متعلقہ فیصلوں کے قانونی اثرات ابھی تک حتمی طور پر نافذ نہیں ہو سکے۔ یہ تاریخی پس منظر اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ مسلم فیملی لاز آرڈیننس کو عملاً آئین سے بھی زیادہ تحفظ دانستہ یا نادانستہ طور پر فراہم کیا گیا ہے۔ آئین بن جانے کے بعد تا ہنوز 53 برسوں میں 26 مرتبہ ترمیم سے گزرا، حالانکہ اس کے لیے دو تہائی اکثریت درکار ہوتی ہے، جبکہ 65 برس گزر جانے کے باوجود ایک مرتبہ بھی آرڈیننس کی قابل اعتراض شقوں میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، حالانکہ اس میں تبدیلی کے لیے محض سادہ اکثریت درکار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ نکاح و طلاق سے متعلق جو دیگر قوانین بنے ہیں، ان میں بھی شریعت کے خلاف شقیں شامل کی گئی ہیں، اس لیے اگر اس معاملے میں بھی قانون سازی کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ اس کے بعد بننے